سنبھالتا چلا آرہا تھا اور اس کا دوسرا ہاتھ فضا میں بلند تھا اور اس کی گرفت میں دو پنجے تھے جن کے آخر میں قوسِ قزح کے سب رنگوں سے مزین ایک پرندہ جھولتا تھا...

"سائیں ریت میں دھنس کر دم رو کے بیٹھا رہا پوری دوپہر... تو یہ ملا ہے۔" اس نے بازو مزید بلند کر کے پرندے کی نمائش کی "سُرخاب ہے۔"

وہ مردہ تھا لیکن زندہ لگتا تھا... اس کے حیرتوں بھرے رنگ اسے مرنے نہیں دیتے تھے...

سرور اور ماماں فوراً اس کے گرد ہو گئے۔ اس کے موٹے بدوضع کندھوں کو تھپک تھپک کر داد دینے لگے۔ جیسے وہ ایک سورما ہو جو میدانِ جنگ میں اپنے دشمن کو مار کر اٹھا لایا ہو... انہوں نے اس کی مٹھی میں بھنچے پنجوں سے لٹکتے سرخاب کی جانب ایک نظر بھی نہ کی...

سورما اپنی بہادری کے قصے بیان کرنے لگا... "میں سویرے سے ان کا پیچھا کر رہا تھا... کبھی اس ٹاپو پر اترتے تھے اور کبھی دریا پار چلے جاتے تھے.. پر میں نے پیچھا نہیں چھوڑا... پورا جھنڈ تھا... ریت میں ریت ہو کر بُت بنا بیٹھا رہا۔ جب یہ چراگاہ میں چرتے تھے... اور جب میں نے شست لگائی ہے سرور.. لبلبی دبائی ہے تو اس کے دبانے سے ان کو خبر ہو گئی اور یہ بجلی کی طرح اڑان میں آگئے پر یہ والا کوئی بھولا پنچھی تھا پَر کھول رہا تھا کہ چھروں کی زد میں آگیا۔"

"واہ سائیں واہ" وہ داد دیتے تھے..

"سرور ابھی اس کی کھال کھینچتے ہیں اور ہانڈی میں ڈال کر بھونتے ہیں اور صاحب کو کھلاتے ہیں۔" وہ اپنی ٹرافی بلند کیے اس کے پاس آگیا تاکہ اس سے بھی داد وصول کرے۔

"آپ کے لیے تحفہ ہے سائیں۔"

"نہیں..."

سرور کی رال ٹپکنے لگی۔ "کیوں نہیں سائیں سُرخاب کوئی روز روز ملتا ہے... آپ بے شک گوشت کھانا... ہم ہانڈی پونچھ لیں گے... یہ بڑا کمینہ پکھیرو ہے سائیں... نصیب والے کے ہاتھ لگتا ہے..."

"ذرا اسے ہاتھ لگا کر دیکھو تو سہی سائیں.." عطاءاللہ سُرخاب اس کی آنکھوں کی سطح پر لے آیا۔ "ابھی گوشت گرم ہے اور دل دھڑکتا ہے۔"

"تمہاری مہربانی ہے بھائی عطاء اللہ..." خاور چائے کی پیالی ریت پر رکھ کر مشکل سے اٹھا کہ اس کے گھٹنے اذیت دیتے تھے۔ "آپ فہیم کے دوست ہو پر آپ ہمارا اپچھانہ کرو.. تمہارا اشکار مجھے گوارا نہیں۔ اسے تم ہمارے الاؤ پر نہیں بھون سکتے.. تم سمجھتے ہو ناں.. اسے لے جاؤ.. اور ہمارا اپچھانہ کرو.. تمہاری مہربانی ہے۔"

عطاء اللہ کے لشکتے دانت سیاہ ہونٹوں میں غروب ہو گئے اور اس کے چہرے پر یکدم ایک ایسی ناگواری آئی جو صرف کٹھور لوگوں کے چہروں پر ہی آسکتی ہے۔ ایک نفرت سے بھری تھوکتی ہوئی ناگواری "سائیں ہم تو باہر کے مہمان کی عزت کرنے والے لوگ ہیں.. آپ عزت نہیں کروانا چاہتے تو خیر ہے.. ہم تو سائیں برمانی کے صدقے آپ کا خیال رکھتے ہیں نہیں تو ہم بڑی حیثیت والوں کو بھی سلام تک نہیں کرتے".. اس کا ہاتھ نیچے آگیا اور سرخاب کی مردہ چونچ اس کے ڈھلکے ہوئے تہبند سے ٹکرانے لگی.. اس کے پروں کے رنگ عطاء اللہ کے بدرنگ تہبند پر بھی اثر کرنے لگے۔ "سندھ کے ٹاپو اور پرندوں کی چراگاہیں تمہاری ملکیت میں تو نہیں ہیں سائیں کہ تمہاری اجازت کے بغیر ہم ادھر نہ آئیں .. ہم ادھر کے باسی ہیں جب جی چاہے گا آنکلیں گے اور جل مرغی اور سرخاب ماریں گے.. ویسے یہ جو کشتی کرائے پر لے کر ادھر آنے والے لوگ ہوتے ہیں ہم ان سے واقف ہیں.. دارو پیتے ہیں اور... پکھی کو..." اس نے زہر اگلا اور بندوق کو اور مردہ سرخاب کو ریت پر رکھ کر اپنے ڈھلکتے اور تقریباً گر جانے والے تہبند کو کھول کر پھر سے اپنی توند پر جمایا اور پھر بندوق اٹھا کر... سرخاب کو جھلاتا ہوا ٹیلوں کی جانب چلا گیا...

سرور اور ماماں سمجھ نہ سکے..

یہ سائیں کب ان کی سمجھ میں آتا تھا..

کتنے روز ہو گئے تھے سندھ کے ٹاپوؤں اور جزیروں میں رات کرتا... پکھی پر نظر نہ کرتا... یہ سائیں کب سمجھ میں آتا تھا۔

سرور چپکے سے کشتی کے اندر چلا گیا اور جعفر پھر سے جال میں گرہیں باندھنے میں مگن ہو گیا... خاموش رہ کر انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔

دوپہر تو ڈھلتی تھی مگر سورج کی تمازت ریت کے ہر ذرے میں ابھی تک ٹھہری ہوئی ہے البتہ پانیوں پر سے آتی ہوا میں ٹھنڈک کے سائے محسوس ہونے لگے تھے۔

اوپر آسمان دُھلا ہوا اور بالکل خالی تھا...

اس میں اڑان کرنے والا ایک سُرخاب کم ہو چکا تھا جو اب ریت کے ٹیلوں میں روپوش ہو چکے عطاء اللہ کے ہاتھ میں لٹکتا تھا... اگرچہ مردہ تھا لیکن زندہ لگتا تھا کہ اس کے رنگ اسے مرنے نہیں دیتے تھے...

اس خالی آسمان تلے پھیلے ہوئے سندھ کے پانیوں میں کشتی ہلکورے لیتی کنارے کی ریت سے سر ٹکراتی تھی۔ آسمان صرف اس ایک سرخاب کی موت سے خالی ہو گیا تھا۔ وہ اسے ایک گہرے رنج سے تکتا جا رہا تھا..

وہاں کوئی پرندہ نہ تھا.. اس کی نیلاہٹ کو اپنے پروں کی قینچی سے کاٹتا کوئی پکھیرو اڑتا نہ تھا۔

پر ایک پرندہ تھا..

اس کے بازو لکڑی کے تھے۔ وہ بے آواز نیلگوں آسمان پر تیرتا ایک ہموار رفتار سے خاور کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر لکڑی کے بھدے سے پنکھے تھے جو بہت آہستگی سے گھومتے جاتے تھے..

اوپر لکڑی کا ایک جہاز محوِ پرواز تھا۔

اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ پُوا جی اس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اپنی سفید پگڑی گھٹنوں کے گرد باندھے سر جھکائے بیٹھے ہیں اور ان کی سفید لٹیں اسی آہستگی کے ساتھ جس آہستگی کے ساتھ جہاز جا رہا تھا ہوا میں اٹھتی تھیں... ایک اور طوفان نوح کی آمد سے پیشتر وہ اپنے اللہ لوک کے ہمراہ پرواز کرتے تھے۔

لکڑی کا جہاز سندھ کے اس ریتلے ٹاپو کے عین اوپر سے گزرتا جاتا تھا جہاں لکڑی کی کشتی کسی بھی طوفان سے بے خبر پانیوں میں ہلکورے لیتی کنارے کی ریت سے سر ٹکراتی تھی.. خاور کے سر پر سے گزرتا تھا اور پُوا جی اس میں سوار تھے۔

سانسیوں کی ٹھٹھی پر ٹھہرے تاریک آسمان میں یکدم کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

رسول پور کے گھنگھور سناٹے پر ان کی گونج مدھم ہو کر جب کچے گھروندوں کی بھُس اور گارے سے تعمیر کردہ اُن موٹی دیواروں تک آئی جو گلیوں میں تھیں تو وہ اُن میں جذب ہو کر معدوم ہوتی گئیں۔ لیکن اس کے کانوں میں وہ سب کُتے الگ الگ بھونکتے رہے... اس لیے کہ وہ رسول پور سے باہر بُوٹی سے ڈھکے جوہڑ کے کنارے کیکر کے جس سوکھے ہوئے ٹُنڈ پر براجمان تھا وہ سانسیوں کی ٹھٹھی کے قریب تھا.. وہ الگ الگ بھونک رہے تھے اور چپ نہیں ہو رہے تھے.. ان میں وہ بُولی بھی شامل تھا جس کی وجہ سے اسے شلوار ترک کر کے دھوتی باندھنی پڑی تھی.. وہ ایسا گنوار کتا تھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی شلوار نہیں دیکھی تھی اس لیے جب وہ رسول پور کی پہلی سویر میں.. کسی بھی گاؤں کی اپنی پہلی سویر میں ماسٹر رحمت علی کے پکے گھر میں سے نکل کر اپنا بستہ سنبھالتا بُوٹی سے بھرے جوہڑ کے کنارے اپنی کلف لگی شلوار کیچڑ سے بچاتا سانسیوں کی ٹھٹھی کے قریب پہنچا تھا تو کلف کی کھڑ کھڑ نے کتوں کے کان کھڑے کر دیئے اور وہ ان کھڑے کانوں کے ساتھ اس کے پیچھے پڑ گئے تھے.. ان کا سرغنہ یہی چتکبرا بُولی تھا جو سب سے آگے آگے غرّاتا غضب ناک ہوتا اس کی شلوار کے پائنچوں کی جانب انتہائی رغبت سے بڑھ رہا تھا.. اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی اور جب وہ پریشان حال کیچڑ میں لت پت ڈیرے پر پہنچا تھا تو چاچا ماسٹر نے کہا تھا "خاور پتّر کل سے یہ پگڑی پہن کر نہ آنا یہ شہریوں کا پہناوا ہے.. اپنی چاچی سے کہنا وہ تمہیں میری کوئی پرانی دھوتی دے دے گی.. اسے پہن لینا.. یہاں دیہات

میں کوئی شلوار پہن لے تو بڑی نموشی ہوتی ہے.. کتے بھی اسے پسند نہیں کرتے.."

اور تب سے وہ ایک واہیات کپڑے کو کمر کے گرد لپیٹ کر اسے ازار بند سے باندھ کر قائم رکھتا تھا ورنہ اس کے بغیر وہ فوراً گر جاتی تھی اور پھر زیادہ نموشی.. یعنی بے عزتی ہوتی تھی..

یہ وہی چتکبرا بُولی تھا جو سب سے بلند آواز میں بھونک رہا تھا۔ کتے کا بچہ!

لیکن یہاں کیکر کے اس ٹُنڈ کے اوپر بیٹھا وہ اس کی زد سے باہر تھا..

چتکبرے بُولی کے بھونکنے میں کوئی جان لیوا غراہٹ نہیں تھی.. اس کے ہمنوا بھی صرف اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ بھونکنے کا فرض ادا کر رہے تھے.. اور یہ فرض وہ ہر جمعے کی رات کو باقاعدگی سے ادا کرتے تھے..

آہستہ آہستہ ان کے بھونکنے میں وقفے آنے لگے..

اس کا مطلب تھا کہ پُوا جی سانسیوں کی بھٹھی سے باہر آ گئے تھے۔

پر ابھی وہ دکھائی نہیں دے رہے تھے..

تاریکی اتنی گھنی تھی کہ وہ اگرچہ وہاں تھے لیکن دکھائی نہیں دیتے تھے.. اس نے اپنا کان سانسیوں کی بھٹھی کی جانب کیا اور بدن کو سننے کے لیے تیار کر لیا..

کتے چپ ہو گئے اور سناٹا پھر سے اتر آیا.. اس کیکر کے ٹُنڈ پر وہ زیادہ گھنا اور بھید بھرا تھا جس پر براجمان وہ پُوا جی کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ کان لگائے سنتا رہا..

پُوا جی کی لرزتی آواز آنی تھی.. اور وہ آنے لگی.. اندھیرے میں سرایت کرتی اس سے لڑتی جھگڑتی کہ میں نے تمہارے پار جانا ہے وہ آنے لگی.. اس کی لرزش خاور کے کانوں تک پہنچنے لگی..

بال چراغ عشق دا...

پُوا جی ہمیشہ یہی چراغ روشن کرتے تھے۔

بال چراغ عشق دا میرا روشن کر دے سیناں...

ان کے سینے پر بال نہیں تھے لیکن ماس کیا ملائم اور پسلیوں پر ریشم کی مانند کسا ہوا تھا...

دل دے دیوے دی روشنائی جاوے وچ زمیناں..

وہ جانتا تھا کہ جب یکدم پو اُجی اپنی باریک اور لرزش میں سرسراتی آواز اونچی کرنے کی کوشش میں گھگھیا جاتے تھے اور اول حمد ثنا الٰہی جو مالک ہر ہر دا... گانے کی سعی کرتے تھے تو یہ وہی لمحہ ہوتا تھا جب وہ کیکر کے اس ٹنڈ کی قربت میں آجاتے تھے جس پر وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ ایک شہری بچہ تھا۔

اپنے پہلے گاؤں کی پہلی رات میں وہ بالکل اندھا ہو گیا تھا اور ہاتھ پھیلا کر اٹک اٹک کر لاکھ وسوسوں اور دل کو مٹھی میں لے کر قدم دھرتا تھا کہ ابھی ٹھوکر کھا کر گروں گا۔ جوہڑ کے اندر... کسی درخت کے تنے سے جا ٹکراؤں گا۔ کسی کچی دیوار میں جا گھسنے سے میری ناک چپٹی ہو جائے گی لیکن کچھ اندھیاری شبوں میں بھٹکنے کے بعد اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا ہے... گاؤں کی شب دیجور میں۔ کالی شاہ رات میں بھی کہیں روشنی کے کچھ ذرّے ہوتے ہیں جو درختوں دیواروں اور انسانوں کو نیم نمایاں کر دیتے ہیں۔

اول حمد ثنا الٰہی...

بجھے کوئلوں پر ابھری راکھ ایسی سلیٹی رنگت کے گدھے پر سوار حضرت عیسیٰ چلے آرہے تھے۔

ان کے سفید لشکیلے بال ان کے کندھوں تک آتے تھے۔

وہ صرف ایک سفید تہبند میں ملبوس تھے اور اس سے اوپر ان کا کھلا بدن اندھیرے میں بھی لو دیتا تھا۔

مشن سکول کے کلاس روم کی دیوار پر آویزاں اس نے حضرت عیسیٰ کی ایک تصویر دیکھی تھی۔ اگرچہ وہ بہت ڈھکے ہوئے ایک لمبے چوغے میں ملبوس ایک گدھے پر سوار تھے اور ان کے سر کے گرد ایک نورانی ہالہ روشن تھا۔ لیکن پو اُجی بھی ان سے کم نہ تھے۔

"پو اُجی..."

پو اُجی اسی لمحے... ایس عجائب بانے اندر آدم در رُکھ لایا... تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے گدھے کو تھپک کر "بس وچھیریا..." کہا... اور وہ انہی قدموں پر رک گیا۔ پو اُجی نے اوپر دیکھا۔ وہ انہیں ٹنڈ پر بیٹھا نظر تو نہ آیا لیکن انہوں نے بہر طور بڑے غور سے اس کی جانب دیکھا۔ "پتر خاور..."

"آہو پو اُجی.." وہ کود کر نیچے آ گیا..

"آ جا..." انہوں نے گدھے پر جگہ بناتے ہوئے ذرا پیچھے کھسک کر کہا۔

خاور اسی جست کے تسلسل میں پھر کودا اور پو اُجی کے آگے ان کی گود میں جا بیٹھا۔

"چل وچھیریا۔"

گدھا پھر سے چلنے لگا..

"پو اُجی آپ اپنے پیر سے مل آئے۔"

"پتر وہ پیر نہیں اللہ لوک ہے.."

"یہ اللہ لوک کیا ہوتا ہے پو اُجی۔"

"جو اللہ کا لوک ہوتا ہے.. اس کا بندہ ہوتا ہے۔"

"ہم بھی تو اس کے بندے ہیں پو اُجی..."

"آہو... پر وہ اللہ سے باتیں کرتا ہے.."

"کیا باتیں کرتا ہے' پو اُجی؟"

"پتر یہ معرفت کی باتیں ہوتی ہیں.. ہم کمینوں کی سمجھ میں نہیں آتیں.."

"کونسی زبان میں باتیں کرتا ہے پو اُجی؟"

"پتر اللہ کی کوئی زبان نہیں ہوتی.. بناشک پنجابی میں بات کر لو تو وہ سمجھ جاتا ہے.. جیسے میاں محمد بخش صاحب کی باتیں سمجھ جاتا تھا.."

"تو پھر پو اُجی آپ خود ہی اللہ سے باتیں کر لیا کرو وہ سمجھ جائے گا.. اتنی دور جاتے ہو اللہ لوک کے پاس یہ سننے کے لیے کہ آج اللہ میاں نے کیا کہا ہے.."

"چپ کر کیا بینڈے کی طرح بولتا جاتا ہے.. اور میں نے تو تمہیں منا ہی کی تھی کہ رات کے وقت پنڈ سے باہر آ کر میری اُڈیک میں نہ بیٹھا کر... تو کیوں آیا ہے؟"

"میرا جی چاہتا تھا پو اُجی.." پو اُجی کے سوہنے اور سنہری ریشم ورگے لچھے کی خوشبو سے وہ خوش ہو گیا اور پھر بینڈے کے طرح ٹر ٹر بولنے لگا "پو اُجی جب آپ سانسیوں کی بھٹنی میں سے گزرے تھے تو وہ چتکبرا بُولی بھونکا تھا ناں؟"

"آہو... پر وہ مجھے کچھ کہتا نہیں ہے پر اس کے بھونکنے سے سانسی اپنے چھپروں میں سے نکل کر میرے وچھیرے کو بڑی حسرت سے دیکھتے ہیں کمینے.."

"پر کیوں پوا جی؟"

"وہ اس کی کھال کو دیکھتے ہیں پتر... کہ جب یہ مر جائے گا تو پہلے اس کا گوشت کھائیں گے پھر کھال اتار کر چھپر کے نیچے فرش پر بچھائیں گے۔"

"یہ سانسی کھوتا بھی کھا جاتے ہیں پوا جی؟"

"آہو... مردار کھاتے ہیں... کچھوے، ڈڈو اور کرلے بھی کھا جاتے ہیں کمینے.. یہ تو پھر وچھیرا ہے..."

"پر پوا جی یہ تو گدھا ہے تو آپ اسے وچھیرا کیوں کہتے ہیں... کیوں پوا جی؟"

پوا جی نے ہاتھ آگے کر کے گدھے کی گردن پر ایک لاڈلی تھپکی دی "یہ عام کھوتا تو نہیں ہے پتر... اللہ لوک کے آستانے پر حاضری دینے والا جانور ہے... یہ ناں ہے تو کھوتا پر وچھیروں کی طرح پھرتیلا اور ستھرا ہے..."

"ستھرا تو آپ بناتے ہیں پوا جی... اسے نہلاتے ہیں کنگھیاں کرتے ہیں..."

"آہو.. پر اس کے کھوتا ہونے میں بھی ایک بڑا فائدہ ہے... اگر یہ سچ مچ وچھیرا ہوتا ناں.. گائے کا بچہ تو رسول پور کے لوگ اسے کب کے ذبح کر کے کھا چکے ہوتے... اسے چوری کر کے... تو اب چونکہ یہ کھوتا ہے اس لیے اسے کھا نہیں سکتے... یہ فائدہ ہے.."

پوا جی نے سر جھٹک کر اپنے شانوں پر آئے سفید بالوں کو سنوارا اور "ہو وچھیرے" کہہ کر گدھے کو ذرا تیز چال میں ڈال دیا۔

پوا جی گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے...

خاور کے لیے یہ ایک حیرت ناک انکشاف تھا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو گوشت نہیں کھاتے۔ عید بقر عید پر بھی نہیں کھاتے... بے شک سالن میں صرف ایک بوٹی ہو، ہانڈی میں سے صرف شوربہ یا سبزی ان کی تھالی میں ڈال دیا جائے تو وہ منہ پھیر لیتے تھے کہ انہیں ماس کی بُو آجاتی تھی.. خاور کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ زندہ کیسے رہتے ہیں... مرغی بھی نہیں کھاتے تھے۔ وہ اس کی زندگی میں پہلے شخص ایسے تھے جو گوشت سے پرہیز کرتے تھے۔

"پوا جی آپ گوشت کیوں نہیں کھاتے؟" اس نے ایک مرتبہ پھر وہی سوال دوہرایا جس کے جواب میں پوا جی صرف اتنا کہتے تھے "بس روح نہیں مانتی.."

"پر کیوں نہیں مانتی پوآجی؟"

"تو چپ نہیں کرتا بینڈے.."

"نہیں چپ کرتا" آپ بتائیں روح کیوں نہیں مانتی.."

"میرا دل کرتا ہے پتر کہ اس جہان میں آوازیں ہوں... بندے بشر تو باتیں کرتے ہیں ناں مجبوری کے لیے... دوسروں سے کچھ حاصل حصول کے لیے.. دل فریب کرنے کے لیے.. پردہ پوشی اور کچھ چھپانے کے لیے.. غیبت اور برائی کرنے کے لیے.. کوئی ایک آدھ بات میاں محمد بخش' جیسی بھی ہوتی ہے پیار محبت اور الفت کی.. باقی تو سب فریب اور دکھاوا ہوتا ہے.."

"اس لیے آپ گوشت نہیں کھاتے پوآجی؟"

"اوئے بینڈے بات تو پوری سن لے.. چپ کر... تو باتیں بندے بشر کرتے ہیں اور آوازیں ڈھور ڈنگر.. جنور اور پرند چھیر و نکالتے ہیں... تو میرا دل کرتا ہے کہ اس جہان میں یہ آوازیں قائم رہیں.. بھیڑ بکریاں.. مال مویشی اور پرندے بولتے رہیں.. اگر ہم ان سب کو کھا جائیں گے تو خموشی ہو جائے گی ہر طرف.. سویرے سویرے چڑیاں نہ بولیں تو صبح رہ جائے گی.."

"پر پوآجی باقی سب لوگ کھاتے ہیں آپ نہیں کھاتے تو اس سے کیا فرق پڑے گا.."

"بینڈے.. میں نے آج تک اگر گوشت نہیں کھایا تو کوئی ایک وچھیرا یا بکرا تو رہ گیا ہوگا ناں.. کوئی ایک پرندہ تو آسمان پر اڈاریاں مارتا ہوگا ناں.."

یہ منطق اس کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ ٹرانے سے باز آگیا اور چپ ہو گیا۔

بڑے جوہڑ کے کنارے گدھے کے پاؤں کیچڑ میں دھنسنے لگے۔ پوآجی نے اُسے دو تین بار پیار سے تھپکا اور "چل وچھیرے چل" کہا تو وہ سر ہلاتا خشکی پر آگیا اور اطمینان سے چلنے لگا۔

خاور کے عین سامنے دو نوکیلے کان کھڑے تھے جو رات کی سیاہی میں دھیرے دھیرے ہلتے جاتے تھے۔ گدھا اپنے راستے سے خوب واقف تھا۔

بڑا جوہڑ پیچھے رہ گیا.. اس کی بُوٹی میں پوشیدہ ٹرانے مینڈک اور جھینگروں کا شور بھی پیچھے رہ گیا..

"جو ٹلخ ہے ناں چینن کا.. اس کے بارے میں سُنا ہے وہ چھینی ناکوں والے سب کچھ کھا جاتے ہیں اسی لیے وہاں نہ مینڈک ٹراتے ہیں اور نہ جھینگر بولتے ہیں.. ہر طرف بس خموشی ہوتی ہے.. آہو۔"

یکدم تاریکی میں ایک اور تاریکی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ گھنی اور اندھی در آئی..

گدھا گاؤں کی پہلی گلی کے اندر داخل ہوا تو پکی اور موٹی دیواروں نے اسے گھیر کر باہر کی تاریکی کو روک کر مزید اندھیرا کر دیا.. پھر خاور کے سامنے جو دو نوکیلے کان مسلسل حرکت میں تھے ساکت ہو گئے اور گدھا رک گیا..

پو اُجی نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے بڑی احتیاط اور آسانی سے اٹھایا اور نیچے اتار دیا.. نیچے ہوتے ہوئے اس کا ایک پاؤں نالی میں چلا گیا جسے اس نے مشکل سے کھینچ کر باہر نکالا لیکن وہ محسوس کر سکتا تھا کہ پاؤں کیچڑ سے بھر گیا ہے..

پو اُجی کے سفید بال ان کے مضبوط اور ملائم کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اور تاریکی میں وہ خود تو کم نظر آتے تھے لیکن ان کے بال صاف دکھائی دیتے تھے..

"پتر.." پو اُجی نے آہنی میخوں اور کوکوں سے مزین چوبی دروازے کو دھکیلنے سے پیشتر ایک ہاتھ سے دچھیرے کو تھپکا اور دوسرا ہاتھ پیار دینے کے انداز میں اس کے سر پر پھیرا..

"میرے اللہ لوک کو بشارت ہوئی ہے.. آج جمعہ کی نماز پڑھانے کے بعد انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ اگلے جمعے.. اس دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا.. انہیں بشارت ہوئی ہے.. تم کسی اور سے ذکر نہ کرنا.."

"پو اُجی.."

"چپ بیٹھے۔"

"لیکن پو اُجی.."

"چپ.." انہوں نے سختی سے کہا..

پو اُجی نے دروازہ دھکیلا.. اندر بھی اندھیرے کی راجدھانی تھی اور صحن میں کوئی نہ تھا.. سب لوگ کوٹھے پر اپنی چارپائیوں میں سفید کھیس اوڑھے نیند میں فنا تھے.. انہوں نے صحن کے کونے میں مویشیوں کی کشتی نما کھرلی کے پاس گدھے کو باندھا' تھپکا اور مڑ کر کہنے لگے "چپ.. کسی کو بتانا نہیں..."

چھت پر اس کا بستر بچھا تھا اور اب تک اس کا سوتی کھیس اور کھدر کی چادر گرمیوں

کی رات میں بھی خاصی ٹھنڈک جذب کر چکے تھے لیکن وہ پوا جی کے ہمراہ اوپر جانے کی بجائے اپنی کوٹھڑی میں چلا گیا۔۔

دروازہ کھول کر گھپ اندھیرے میں دیکھتا اندر چلا گیا۔

کوٹھڑی میں رنگین پایوں والی نواری چارپائیاں ایک ہاؤس آف کارڈز کی طرح ایک دوسرے کے اوپر ایسے قائم تھیں جیسے ابھی ابھی گر جائیں گی اور سب سے نچلی چارپائی کی ننگی نوار پر اس کا سوٹ کیس دھرا تھا۔۔ سفید نوار پر اس کا سیاہ سوٹ نمایاں نظر آتا تھا۔۔

اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر سوٹ کیس کو نزدیک کیا اور اسے کھول کر اس کونے میں ہاتھ پھیرا جہاں اے بی سی بسکٹوں کا وہ ڈبہ موجود تھا جو وہ شہر سے اپنے ساتھ لایا تھا۔۔ اس نے ٹٹول کر صرف ایک چینی لگا بسکٹ نکالا اور اپنے منہ میں رکھ لیا۔۔ اور چبائے بغیر اسے وہیں رہنے دیا۔۔ اُس بسکٹ کا بیکری میں پکا ہوا میدہ اور اس پر چپکے چینی کے دانوں کا ذائقہ اسے اس نامراد گاؤں سے واپس اپنے شہر لے جاتا تھا جہاں یہ بسکٹ ہوتے تھے۔۔ سوڈا واٹر کی بوتلیں اور آئس کریمیں ہوتی تھیں۔۔ اس سے پیشتر کہ یہ ذائقہ گھل کر حلق سے نیچے چلا جاتا زائل ہو جاتا اس نے کوٹ کی تہہ میں بچھے پرانے اخبار پر ہاتھ پھیرا۔۔ وہ درجنوں بار دن کی گرم روشنی میں اس اخبار کو آنکھوں کے قریب لا کر اپنے شہر میں پہنچ جاتا کیونکہ یہ وہ صفحہ تھا جس پر لاہور کے سینما گھروں میں دکھائی جانے والی فلموں کے مختصر اشتہار تھے۔۔

اوڈین' پلازا' ریگل' کیپٹل' صنوبر' ریجنٹ۔۔ ایسے طلسمی گھر جن میں "پتن" "جال" "دو آنسو" "ہنچ بیک آف نوٹرڈیم" اور "نیاگرا" ایسے جادو چلتے تھے۔

وہ دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اس صفحے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ان کی ایک ایک سطر اور تصویر سے آگاہ ہوتا تھا اور اسے یہ اطمینان ہوتا تھا کہ وہاں میرا ایک شہر ہے جہاں شائد اس لمحے یہ فلمیں سکرین پر چل رہی ہیں اور تماشائی سوڈا واٹر کی بوتلیں پی رہے ہیں۔

اس نامراد گاؤں سے فرار اس کا سب سے بڑا خواب تھا۔

اسے زبردستی۔۔ تقریباً ہاتھ پاؤں باندھ کر رسول پور بھیج دیا گیا تھا۔

صرف اینگلو ورنیکلر کے فائنل امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے۔

ماسٹر رحمت علی اس کے ابا جان کے بہت قریبی دوست تھے۔ باریش اور بلند قامت۔۔ کرخت طبیعت کے اور نرمی سے یکسر نا آشنا" شاہ صاحب۔۔ شہر میں بچہ چوڑ ہو جاتا

ہے .. گرمیوں کی چھٹیوں میں اسے میرے ساتھ رسول پور بھیج دیجئے وہاں یہ ریڈیو اور فلموں وغیرہ کی لغویات نہیں ہوں گی .. میں اسے پڑھاؤں گا.. انشاء اللہ ورنیکلر فائنل میں اچھے نمبر لے گا.. اصل امتحان تو یہی ہے میٹرک تو معمولی بات ہے.."

شاہ صاحب نے اپنے اکلوتے بچے کو ورنیکلر فائنل پر بلا جھجک قربان کر دیا اور اسے ماسٹر رحمت علی کے سپرد کر کے گاؤں بھجوا دیا ..

یہ گاؤں پتہ نہیں کہاں تھا..

شاید اس کا کوئی وجود نہ تھا اور یہ صرف ایک شہری بچے کو اذیت دینے کے لیے عارضی طور پر تخلیق کیا گیا تھا..

گاؤں کہیں نہ کہیں تو ہوتے ہیں .. لیکن یہ کہیں بھی نہ تھا..

ریلوے تو بہت دور کی بات ہے.. یہ کسی پکی سڑک کے آس پاس بھی نہ تھا جس پر کوئی مکانکی سواری اس کی قربت میں آسکتی.. وہاں سے بھی کوسوں دور تھا..

نزدیک ترین تہذیب یافتہ بستی جہاں پورے دن کی پیدل مسافت کے بعد پہنچا جاتا تھا کوئی قصبہ مگھووال نام کا تھا.. اور وہ بھی رسول پور کا ایک نسبتاً بڑا بھائی تھا۔ اُس قصبے کی تہذیب یا فگی کی سند ایک پکی سڑک اور صرف ایک ڈاکخانہ تھا جس کے عملے میں بھی صرف ایک شخص تھا جو جب کبھی اپنی بھینسوں کو چارہ ڈالنے اور دودھ دوہنے سے فارغ ہوتا تو ڈاک کے لفافے اور کبھی کبھار ٹکٹ فروخت کرنے کے لیے ایک کچے کمرے میں آبیٹھتا جس کے نصف حصے میں بخس کا ایک تودہ براجمان تھا ..

رسول پور سے اول تو کسی کو خط لکھنے کی حاجت ہی پیش نہیں آتی تھی اور اگر یہ وقوعہ ناگزیر ہو جاتا تھا تو اس خط کو لکھنے والا صرف ماسٹر رحمت ہی تھا جو اس خط کو لکھنے کے بعد اسے اپنے تہبند کی کسی گرہ سے اڑس لیتا اور وہ مدتوں وہیں رہتا کہ اسے پوسٹ کرنے کے لیے ایک لفافہ درکار ہوتا اور وہ ڈاک کا لفافہ صرف مگھووال کے ڈاکخانہ سے ہی فراہم ہو سکتا تھا اور اکثر اوقات نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ پوسٹ ماسٹر کی کوئی بھینس دودھ دینے سے انکاری ہو جاتی تھی اور جب تک وہ دودھ نہ دے پوسٹ ماسٹر صاحب کیسے ڈاکخانے میں آسکتے تھے۔ اور اگر یہ لفافہ کسی آنے جانے والے کے ہاتھوں وہاں سے منگوا بھی لیا جاتا تو خط اس میں ڈال کر پھر سے اسے مگھووال بھجوا کر پوسٹ کرنے کا مرحلہ شروع ہو جاتا تھا۔

چنانچہ رسول پور میں خط و کتابت کا کچھ زیادہ رواج نہ تھا۔۔

پورا گاؤں کچا تھا۔۔

صرف ماسٹر رحمت علی کا پسار پکا تھا ۔۔ لیکن وہ کوٹھڑی بھی کچی تھی جس میں نواری چارپائی پر اس کا سیاہ سوٹ کیس بے وجہ لگتا تھا۔

شہر کی نسبت رسول پور کے آسمان پر ستاروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ چمکتے بھی بہت بے بہا تھے ۔۔ ابھی رات کے بھیگنے سے جو مدھ بھری غنودگی وارد ہوتی ہے خاور اس میں گم اور بے ہوش ہوتا تو چاچا ماسٹر کی کرخت آواز اسے بیدار کر دیتی۔ "اوئے خاور ۔۔دوپہر ہو گئی ہے اور تو سویا پڑا ہے ۔۔اُٹھ۔"

وہ آنکھیں ملتا اٹھتا تو دوپہر میں ستارے روشن ہوتے ۔۔

نیچے صحن کی تاریکی میں سے اوّل نمبر چاچی کی مدھانی کی آواز بلند ہو کر ستاروں تک یہ خبر لے جاتی کہ چاٹی میں گھومتی مدھانی میں مکھن گھنا ہو رہا ہے اور دودھ کے رڑھکنے سے زور لگ رہا ہے ۔۔مدھانی کی روانی کو ادھ رڑھکے کی گھنی آزمائش روکنے لگتی۔

چاچا ماسٹر کی یہ دیہاتی بیوی جو اوّل نمبر تھی ادھیڑ عمر اور بوسیدہ تھی۔ وہ ہمیشہ سیاہ کرتے اور تہبند میں ملبوس ہوتی اور اس کے پورے سراپے میں سے لسی کی بُو آتی ۔۔وہ سارا سال اس گھر کی اور پو اُجی کی دیکھ بھال کرتی ۔۔برسات کی آمد سے پیشتر بڑے جوہڑ سے مٹی لا کر اس میں بھس ملا کر چھت پر لیپ کرتی اور سردیوں کے دوران پو اُجی کے خشک ہوتے جسم پر مکھن سے مالش کرتی۔۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب اس کا خاوند شہر لاہور میں ماسٹری کر کے لوٹتا تو پھر اس کی خدمت پر جت جاتی ۔۔اس سے کبھی چاچی نمبر دو کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھتی جو سوہنی گوری چٹی اور کم سن تھی اور جسے وہ شہر میں چھوڑ آتا تھا کیونکہ گاؤں کی آب و ہوا اسے راس نہ آتی تھی اور اسے نزلہ زکام ہو جاتا تھا۔

اوّل نمبر چاچی کے لیے یہ بہت تھا کہ وہ ہر برس دو ماہ کے لیے اس کے ہاں ۔۔اس کے صحن میں ۔۔اپنے والد پو اُجی کے پاس لوٹ آتا ہے۔۔

ماسٹر رحمت علی ان دو ماہ کے دوران اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔۔

اوّل نمبر چاچی کی کوئی اولاد نہ تھی۔۔

اور چاچی نمبر دو نے بچوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔۔

ماسٹر صاحب نے اپنے رہن سہن کا بندوبست کچھ یوں کر رکھا تھا کہ آج تک دونوں چاچیوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی.. اور نہ ہی اول نمبر چاچی نے اپنے خاوند کو دوسری بیوی کے فراہم کردہ بچوں کے ڈھیر میں سے کسی ایک بچے کو دیکھا تھا .. ماسٹر صاحب کی شہری حیات الگ تھی اور گاؤں کی زندگی بالکل تھلگ...

تو جب وہ اس تاروں بھری دوپہر کی تاریکی میں آنکھیں ملتا ڈولتا ہوا .. اپنی دھوتی سنبھالتا اٹھتا' کچی سیڑھیوں سے نیچے ویہڑے میں آتا تو دودھ رڑھکنے کی آواز بلند ہو جاتی .. چاٹی کے بند منہ میں مدھانی گھوم گھوم کر اٹکتی اور دھم دھم کی ایک ایسی ردھم ویہڑے کو بھرتی جاتی جیسے سٹیتھو سکوپ میں دل کی دھڑکنے کی آواز دھم دھم سنائی دیتی ہے..

اول نمبر چاچی اپنے خصم کی "اوئے دوپہر ہو گئی ہے اٹھ.." کی پاٹ دار آواز سننے کے چند لمحوں بعد مدھانی کی مٹھیوں پر گرفت ڈھیلی کر کے رک جاتی اور پیچھے مڑ کر دیکھتی تو خاور آخری سیڑھی سے ویہڑے میں قدم رکھ رہا ہوتا۔ "آجاں صدقے.."

خاور ڈولتا ہوا نیم اندھیرے میں چاچی کے قریب پہنچتا تو وہ مدھانی چاٹی میں سے نکال کر ایک کھلے منہ والے تانبے کے کٹورے پر چاٹی کی گردن پکڑ کر اسے جھکاتی اور ادھ رڑھکا مکھن سے گھنا ہوتا دودھ کٹورے کو بھر دیتا اور وہ تاریکی میں ایک سفید چاند کی طرح چمکنے لگتا.. خاور کٹورے کے بھرتے ہی کہتا "چاچی چینی"

"آہو سچ..." وہ ہنستی۔ "شہر یئے چینی بغیر ادھ رڑھکیا بھی نہیں پیتے.. میں لاتی ہوں۔"

چینی' خاور والی کچی کوٹھڑی میں لگی گھڑوں کی پال کے سب سے اوپر والے گھڑے میں سٹور تھی.. چاچی اس میں سے مٹھی بھر کر لے آتی اور ادھ رڑھکے دودھ میں ڈال کر اسے انگلی سے خوب ہلا کر کٹورا اسے تھما دیتی..

یہ گھنا نیم مکھن دودھ اٹک اٹک کر اس کے حلق سے اترتا.. اور اس کی آنکھیں اس کے سرور سے پھر سے بند ہونے لگتیں.. وہ اپنے بدن کے مختلف حصوں کو کھجلاتا دو تین جمائیاں لیتا اور کوکوں سے مزین بھاری دروازہ دھکیل کر گلی میں آجاتا.. کچی دیواروں کو ٹٹولتا نالیوں سے بچتا وہ ہولے ہولے آگے بڑھتا اور جب وہ گاؤں سے باہر نکل کر رسول پور نہر تک پہنچتا تو ہلکی سی روشنی پھیلنے کو ہوتی اور اس میں کچے کوٹھے' کھیت' جوہڑ اور کھرلیوں کے

ساتھ بندھے ڈنگر مویشی ظاہر ہونے لگتے۔

خاور کے لیے اس نامراد گاؤں میں یہ نہر تہذیب کی واحد علامت تھی..

یہ نہر.. سوٹ کیس میں بچھا پرانا اخبار اور اے بی سی بسکٹوں کا ڈبہ..

وہ پٹڑی پر کچھ دور تک جاتا اور پھر نیچے اتر کر پانی کی قربت میں جہاں گھاس اور بوٹیوں کی بہتات تھی وہاں لیٹ جاتا۔

گھاس میں تریل کی نمی اس کے سارے جُسّے کو ٹھنڈا کر دیتی اور وہ اُن تنکوں کو جو اس کے نتھنوں کے آگے سرسراتے ان میں گدگدی کرتے تھے.. توڑ کر انہیں پانی میں پھینک دیتا اور فوراً ہی گہری نیند میں چلا جاتا۔

اگرچہ چاچا ماسٹر کا یہ خیال تھا کہ وہ صبح سویرے بیدار ہو کر نہر کنارے ایک لمبی سیر کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی صحت بہتر ہو گی اور وہ خوب چاق و چوبند ہو کر ورنیکلر کے امتحان کی تیاری کرے گا اور پوزیشن حاصل کرے گا.. لیکن یہ محض خیال تھا۔

وہ مکمل طور پر گہری نیند میں تو نہیں جاتا تھا بس غنودگی کی ایک مست اور ٹھنڈک والی کیفیت میں سرشار لیٹا رہتا.. نہر کے مدھم بہاؤ کی سرسراہٹ اس کے کانوں میں اترتی اترتی رہتی.. پھر ڈنگر مویشیوں کی گھنٹیاں دور سے سنائی دیتیں۔ قریب آتی رہتیں اور "اوئے مریں" "اوئے تینوں چور لے جان" پکارتا اور کوستا کوئی کسان مویشیوں کو ڈنگوری سے ہانکتا پٹڑی پر سے گزر جاتا.. یہ آوازیں بہت دور کی لگتیں.. اس کے بدن کے اندر گھنٹیاں بجاتیں تیرتی نکل جاتیں.. وہ پٹڑی سے نیچے پانی کے قریب تریل اور ہریاول کی گود میں گچھا مچھا ہو کر اونگھتا رہتا.. نہر کے بہنے کی آواز کچھ مدھم ہونے لگتی اور چڑھتے سورج کی کچھ کرنیں پانی میں آنکلتیں اور نہر کا وہ حصہ جو ان کرنوں کی زد میں آتا تھم جاتا.. اور اس کے گرد جو پانی ابھی نیم سیاہی میں ہوتے بہتے جاتے۔ چمکتے پانی کے اس حصے کی لشک سے اس کے بند پپوٹے روشنی سے بھر جاتے.. اور یہی وقت ہوتا تھا کسل مندی سے اٹھنے کا اور گھاس کے گیلے تنکوں کو بالوں میں سے نکالنے اور گھر واپس جانے کا..

وہ گھر لوٹتا تو چاچا ماسٹر اور پوا جی ڈیرے کو جا چکے ہوتے..

وہ اپنا بستہ سنبھالتا' دھوتی کو گرنے سے بچاتا گاؤں سے نکل کر بڑے جوہڑ کے کنارے چلتا' کیکر کے ٹنڈ کے قریب سے ہو کر سانسیوں کی جھگی سے ذرا پرے ہو کر ڈیرے

پر پہنچ جاتا..

چتکبرا بُولی اسے دور سے دیکھ کر ایک بار تو ضرور دُم پُنچ کر اٹھتا اور جبڑے کھول کر غرآنے کا ارادہ کرتا اور پھر اسے دھوتی کی شرافت میں ملبوس پاکر یہ ارادہ ترک کر دیتا۔ وہ تو صرف اس کی شلوار کے پائینچے کا دیوانہ تھا..

ڈیرے پر شیشم کے پانچ درخت تھے..ان کے نیچے بان کی تین چارپائیاں تھیں 'دو گھڑے تھے اور ایک چارے کی کھرلی تھی جو بوائی کے گدھے کے لیے مخصوص تھی..ارد گرد کھیتوں کا پھیلاؤ تھا..

کچھ چارے کے کھیت تھے..پھر گنّے کے بُوٹوں کی بلند دیواریں تھیں اور ڈیرے کے برابر میں جو کھیت تھا اس میں سہاگا پھرا ہوا تھا..

وہ گوٹھ مار کر اپنی دھوتی سے اپنے درمیان کو ڈھکتا بان کی بے آرام کھردری چارپائی پر ابھی بیٹھ ہی رہا ہوتا کہ چاچا ماسٹر اسے حساب کے سوال حل کرنے کے لیے ایک کاپی تھما دیتے جس پر انہوں نے سینکڑوں کی تعداد میں سوال بنا رکھے ہوتے تھے۔

دس بجے کے قریب اوّل نمبر چاچی کماد کے کھیتوں کے کنارے پانی کے کھال کے کنارے ایک مختصر سی بنّی پر چاٹی سر پر اٹھائے اس پر ایک دستر خوان رکھے اطمینان سے چلتی ہوئی ڈیرے کی جانب آتی نظر آنے لگتی۔

یہ بریکفاسٹ ٹائم ہوتا تھا..

بوائی کے لیے کچی لسّی..چاچا ماسٹر کے لیے دو پراٹھے اور اچار..اور اس کے لیے تندور کی باسی روٹی۔ تازہ مکھن اور چائے..اور چینی کی ایک پُڑیا جو وہ مکھن پر چھڑک کر روٹی کے ساتھ کھاتا اور ساتھ میں خالص دودھ کی چائے کے گھونٹ بھرتا..یہ رات کی باسی روٹی اور اس پر مکھن اور چینی..کسی بھی ڈبل روٹی سے زیادہ خستہ اور مزیدار ہوتی تھی..

پھر سارا دن حساب کے سوال..تختیاں..دھوپ تیز ہوتی تو کھیتوں سے آنے والی گوبر اور فضلے کی بُو..اردو گرائمر..انگریزی کے جواب مضمون..چاچا ماسٹر پانچویں جماعت کے کورس کی کتابیں تصنیف کرتے رہتے جو اردو بازار کا ایک ناشر ٹھیکے پر ان سے لکھواتا تھا۔

سورج غروب ہونے لگتا تو وہ بوائی کے ہمراہ گاؤں واپس چلا جاتا..

جب پہلے روز وہ اس کالے پانی کی قید کاٹنے کے لیے شہر سے ایک طویل مسافت

کے بعد مگھووال کے قصبے میں بس سے اترا تھا اور پھر فوری طور پر اس ویران سے قصبے سے باہر نکل کر اپنے آگے آگے چلتے چاچا ماسٹر کی لمبی لمبی پلاہنگوں کے پیچھے پیچھے تقریباً بھاگتے بے حال ہوتے اور گرتے ان کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہلکان ہوتا تھا... اور ابا جان تو جب کبھی اس کے آگے چلتے تھے تو ہر دو قدم پر رک کر پیچھے دیکھتے تھے کہ وہ آ بھی رہا ہے یا نہیں لیکن یہ جو چاچا ماسٹر تھے انہوں نے تو اُس ویران دوپہر کی برباد جہنمی گرمی میں اسے بارہ میل کی مسافت کے دوران.. کھیتوں.. رڑھے میدانوں.. ٹیلوں' قبرستانوں.. ہل چلائی اونچی نیچی زمینوں اور پانی کی خشک کھالوں میں چلتے ہوئے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر یہ اطمینان نہیں کیا تھا کہ وہ آ بھی رہا ہے یا نہیں.. یا وہیں بس کے باہر ہی کھڑا رہ گیا ہے.. نہ پانی کا پوچھا نہ آرام کرنے کو کہا.. بس لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلتے گئے اور وہ ان کے پیچھے سراسیمہ اور خوفزدہ اس لیے کہ اگر یہ آگے نکل گئے اور میں یہیں رہ گیا تو اس بھری دوپہر میں اس ویرانے میں میرے ساتھ کیا ہو گا.. وہ کبھی تیز چلتا.. کبھی دُڑکی لگاتا' پیاس کی شدت سے اور پسینے کی رم جھم میں.. اُن کے پیچھے پیچھے۔

چاچا ماسٹر نے رسول پور پہنچ کر اپنے گھر کا دروازہ پاؤں کی ٹھوکر سے کھولا تو صحن کی ویرانی کے ایک کونے میں سلگتے اپلوں پر رکھی ایک چاٹی کے قریب سیاہ پوش چاچی بیٹھی چرخہ کات رہی تھی اور ماسٹر صاحب کو دیکھتے ہی انہوں نے پُونی ہاتھ سے رکھ دی اور سیاہ چادر کا گھونگھٹ چہرے پر اتار لیا۔ چاچا ماسٹر نے تب بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ ورنیکلر فائنل والا بچہ زندہ بچ بھی گیا ہے یا نہیں.. چاچی کو ایک واجبی سا سلام کر کے کہنے لگے "یہ اپنے شاہ صاحب کا بیٹا ہے خاور.. گرمیوں کی چھٹیوں میں ادھر ہی رہے گا".. اور چاچی نے گھونگھٹ کی اوٹ سے اپنے دس ماہ سے گمشدہ خاوند پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور پھر آگے بڑھ کر اس کے سر پر ایک پیڈو پیار دیا "جی آیاں نوں پتر.."

"پتر.." کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی.. اس لیے کہ وہ بے اولاد تھی۔

رسول پور کا دور افتادہ کچا گاؤں اور اس کی چیلوں سے چیختی بھری دوپہریں اُسے ہول سے بھر دیتی تھی.. اسے یقین نہ آیا کہ زندگی اتنی ٹھہری ہوئی' ساکت اور بے مقصد بھی ہو سکتی ہے.. بس صبح ہوتی ہے اور پھر شام ہوتی ہے.. اور پھر شام ہوتی ہے.. اور گرم دوپہر ہے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتی.. کھیتوں میں گوبر کی بُو ہے.. رُوہڑی پر فصلے کی خشکی

میں سے بدبو اٹھتی ہے.. جوہڑ کے کیچڑ بھرے گدلے مینڈک بھرے پانیوں میں سے سورج کی تپش سے متلی آور بخارات اٹھتے ہیں.. گاؤں کے مکین خاموش ہیں اور اسے عجیب نظروں سے دیکھتے گزر جاتے ہیں.. اور چتکبرا بُولی ہے جو اس کی شلوار کے پائینچے کا شائق ہے.. ایک ڈیرہ ہے.. پانچ شیشم کے درخت.. تین بان کی چارپائیاں.. دو گھڑے.. ایک کھرلی اور ایک گدھا.. اس ہول سے اس ویرانی کے ڈر سے اسے بخار آنے لگا.. لیکن اس نے کسی سے تذکرہ نہ کیا.. اسے سب سے زیادہ غصہ اپنے ابا جان پر تھا.. جنہوں نے اسے جان بوجھ کر اس ہول میں دھکیل دیا تھا.. وہ ان سے کشتی لڑنا چاہتا تھا انہیں زمین پر گرا کر ان کی چھاتی پر مکے مارنا چاہتا تھا.. اسے ان سے ایسی سنگدلی کی ہرگز توقع نہ تھی.. شاید وہ ان کا اصلی بیٹا نہ تھا۔ نقلی بیٹا تھا جسے وہ کسی کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھا کر لائے تھے.. بس یہی وجہ ہو سکتی تھی.. وہ تو ایک شہری بچہ تھا.. اسے شہر چاہئے تھا.. سوڈا واٹر' فلمیں' آئس کریم' بسکٹ' بجلی اور شلوار چاہیے تھی.. کرکٹ کھیلنے کے لیے دوست چاہیے تھے.. اور یہاں کچھ بھی نہ تھا.. سوائے چلچلاتی دوپہروں' کچی دیواروں' گرمی میں ابلتے جوہڑوں اور ایک بے بسی کے.. کہ شہر یہاں سے صدیوں کے فاصلے پر تھا.. پہلے دس بارہ میل پیدل مارچ کرو.. پھر مگھووال آئے گا.. وہاں دن میں ایک لاری آئے گی.. پھر کہیں گاڑی آئے گی اور پھر کہیں.. وہ ابا جان کا نقلی بیٹا تھا یقیناً..

اس نے ابا جان کو فوراً ہی ایک درد بھرا رقت آمیز خط لکھا جس کے آخر میں اس نے زندگی میں پہلی بار "آپ کا اکلوتا بیٹا خاور" لکھا اور وہ خط پورے دس دن اس کی حساب کی کاپی میں پڑا رہا۔ کیونکہ ڈاک کا لفافہ نہ تھا.. اور جب بالآخر مگھووال سے آنے والا ایک کمہار وہاں اپنے گھڑے بیچنے کے بعد چاچا ماسٹر کی فرمائش کے مطابق ایک ڈاک کا لفافہ لے کر آ گیا تو اس نے بے چارگی میں اور بے بسی میں اور شدید طیش کی حالت میں اس خط کو ریزہ ریزہ کر دیا.. ابا جان بھی نقلی تھے انہیں یہ خط بھیجنے سے فائدہ!

اس کی موجودہ زندگی میں صرف پانچ کردار تھے.. چاچا ماسٹر۔ چاچی جی۔ پوا جی' گدھا اور چتکبرا بُولی کتا.. ان کے علاوہ اُس نادار گاؤں میں اور کوئی نہ تھا.. کچے گھروں کے اندر کوئی نہ تھا.. بس ویرانی تھی اور دوپہریں تھیں اور ہول تھا..

پھر ایک روز اس نے صبح سویرے نہر پر جا کر سیر کرنے کی اجازت چاہی.. اور در زنداں میں ایک آبی روزن کھل گیا.. وہ کم از کم سویر کے چند لمحوں میں زندہ اور آزاد

محسوس کرنے لگا۔

چاچا ماسٹر اس پر کڑی نظر رکھتے تھے.. اس کی صحت 'اس کی پڑھائی اور اس کی خوراک کا خیال رکھتے تھے لیکن اس کا خیال نہیں رکھتے تھے وہ ان کے لیے ورنیکلر فائنل کے امتحان کا ایک نالائق پرچہ تھا جسے انہوں نے لائق بنانا تھا..

بو اجی زیادہ فرینڈلی نہیں تھے۔

ان کی عمر کم از کم سو برس کے لگ بھگ تھی..یا شہری بچے کی جتنی عمر تھی اس عمر میں وہ سو برس کے لگ بھگ ہی لگتے تھے.. وہ ہمیشہ ایک سفید تہبند میں ملبوس ہوتے۔ اس سے اوپر کا بدن ڈھانپنا جمعے کی نماز کے علاوہ گناہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ پتر یہ جثہ تو سوہنے رب نے ہنڈانے کے لیے دیا ہے.. برتنے کے لیے دیا ہے 'اس پر کچھ پہن لو تو جثے کا ساہ بند ہو جاتا ہے.. اور ان کا بدن ایک نخریلی گھوڑی کی طرح چکنا ملائم اور بنا چربی کے تھا.. ان کے کندھے بھی ایسے تھے کہ ان پر ہاتھ رکھنے سے ہاتھ پھسلتا تھا.. البتہ وہ اپنے پٹوں کا.. کندھوں تک آتے سفید چمکیلے بالوں کا خاص خیال رکھتے.. انہیں نہایت اہتمام سے لکڑی کی ایک کنگھی سے سنوارتے رہتے.. ڈیرے پر جب وہ بان کی چارپائی پر گوٹھ مارے حساب کے سوال حل کر رہا ہوتا بو اجی ایک کُھرپی سے کھیتوں میں گوڈی کرتے رہتے.. پھر تیلے اتنے کہ پانی کا چوڑا کھال آسانی سے پھلانگ جاتے۔ اپنی چارپائی اٹھا کر ہل چلے کھیت میں چلتے تو ان کی کمر میں بل نہ آتا.. اور کان اتنے تیز کہ اگر ان کے کماد کے کھیت میں سے جو خاصے فاصلے پر تھا کوئی ایک گنا توڑتا تو وہیں ڈیرے پر بیٹھے ہوئے اپنے گدھے کو تھپکتے ہوئے اس گنے کے ٹوٹنے کی مدھم سرسراہٹ سن لیتے بلکہ گنا چور کی صنف کا تعین بھی کر لیتے..

چاچا ماسٹر سے ان کی زیادہ دوستی نہ تھی.. اگرچہ ان کی کل اولاد میں سے.. گیارہ بال بچوں میں سے صرف وہی تھے جو اب تک حیات تھے لیکن وہ ان سے پرے پرے رہتے تھے سلام دعا کے سوا ان سے کوئی کلام نہ کرتے.. وہ ان کی نسبت اپنے گدھے کے زیادہ قریب تھے..

بو اجی اپنی ذات میں گم.. ایک الگ زندگی گزارتے۔

انہوں نے خاور کو بھی کبھی کسی التفات سے نہ نوازا.. کبھی اس کے سر پر ہاتھ نہ پھیرا.. بس ڈیرے پر پہنچنے پر اس کے سلام کا جواب دیتے اور اپنے گدھے کو تھپک کر کھرپی ہاتھ میں لے کر کھیتوں کے اندر چلے جاتے۔

پو اُجی سے اس کی دوستی کا آغاز رسول پور سے آمد کی ستر ہویں سویر سے ہوا..

خاور حسب معمول اس سویر بھی یا اس سویر کی آمد کی قربت میں نہر کے پانیوں کی نزدیکی میں گھاس اور تریل کی نم آلود ٹھنڈک میں گچھا مچھا ہو کر اونگھ رہا تھا جب اس نے ڈنگروں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں اور "اوئے مریں.. اوئے تینوں چور لے جان" اور پانی کے بہاؤ سے الگ ایک اور آواز سنی..

اول حمد خدادی کریئے جو مالک ہر ہر دا..

اس نے آنکھیں کھول دیں کہ یہ آواز بہت نزدیک سے آ رہی تھی۔

اس نے کہنیوں پر ٹیک لگا کر اپنے آپ کو گھاس میں سے ذرا اونچا کیا۔

پو اُجی تھے..

ان کا گدھا تھا..

اور وہ سیاہ چمڑے کے بوکے کو نہر میں ڈبو کر پانی سے بھر کر اسے اپنے گدھے پر انڈیل کر اسے نہلا رہے تھے اور اول حمد خدادی.. گا رہے تھے..

خاور اٹھ کر گھاس میں بیٹھ گیا.. اور پو اُجی اور ان کا گدھا صاف نظر آنے لگے۔

لیکن پو اُجی مگن رہے.. بوکے کو نہر میں ڈبو کر بھرتے اور نہایت اہتمام سے کبھی گدھے کے سر پر اور کبھی پشت پر انڈیلتے.. گدھا بھی اس غسل سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور بالکل بُت بنا اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ انہوں نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں حالانکہ وہ ان کے بالکل سامنے گھاس پر براجمان انہیں تک رہا تھا.. وہ اپنے وچھیرے کے ساتھ کچھ راز و نیاز بھی کر رہے تھے لیکن ذرا سرگوشیوں میں اور اس کے لمبوترے ایستادہ کانوں میں جو اس تک نہیں پہنچ رہے تھے.. گدھے کو دیسی صابن کی چاکی سے مل مل کر نہلانے کے بعد انہوں نے تہبند کی ڈب میں سے اپنی لکڑی کی کنگھی نکالی اور اس کے بال سنوارنے لگے.. ایال سے فارغ ہو کر وہ اس کی دم پر کنگھی پھیر رہے تھے۔ جب خاور نے کہا "ہیلو پو اُجی..."

"اوئے..." وہ چونک گئے... وہ تھوڑے سے اُڑے ہوئے تھے یعنی ذرا خمیدہ تھے اس لئے جب انہوں نے "اوئے" کہا تو وہ دیکھ تو زمین کی طرف رہے تھے اور انہوں نے سر اٹھانے کی بجائے صرف آنکھوں کے پپوٹوں کو اونچا کر کے اس کی جانب دیکھا "اوئے شہریئے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"